جدید ترین رجحانات اور نسل نو

(از قلم: ملک شاہد عزیز انجم)

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

پاکستان کی موجودہ زندگی سے پرانے نقش مٹ رہے ہیں یا مٹائے جا رہے ہیں۔ مٹنے اور مٹانے کا یہ عمل جدید تر اور جدید ترین تعلیم یافتہ لوگ کر رہے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کے دعوے بدستور یہ ہیں کہ ہم دنیا بھر کی اقوام سے خصوصاً ہندوؤں سے جدا قوم ہیں۔ اور یہ دلیل صرف جغرافیے کی حد بندی پر قائم ہے۔ اس کے سوا باقی ہر شے میں، یورپین اطوار کے توسط سے افرادیت کے نقوش غائب کئے جا رہے ہیں۔ اور ایک خاص نفسیات اور جغرافیے کی ایک لکیر کے سوا باہر کے کسی مسافر کے لئے یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے کہ پاکستانی باثروت اور تعلیم یافتہ لوگوں کا معاشرت میں مخصوص اور منفرد نقش کیا ہے؟

حیف! اس مسئلے پر کوئی غور نہیں کرتا کسی خاص منصوبے کے تحت ایک نفسیاتی مرحلہ بندی سے انفرادیت کی دیواریں گرائی جا رہی ہیں۔۔۔۔ اور ان کی جگہ نئے نشانات لگائے جا رہے ہیں اس ثقافتی ادغام کی طرف پہلا قدم موجودہ یورپین طرزِ احساس اور وضع زندگی ہے۔ اس کے سائے میں دوسرے نشانات بھی بتدریج لگ رہے ہیں۔

جدید ترین رجحانات پر بات کرنے سے پہلے ہمیں اس بات کا تعین کرنا ہوگا کہ آخر پاکستان کا اپنا ذاتی کلچر کیا ہے؟ کیا یہ ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو ہمارے ذاتی قابل فخر رجحانات ہونے چاہیں جن میں ارتقاء کا عمل ہو۔ بار دیگر اگر اپنا کوئی کلچر نہیں تو ہم کیوں اس قدر محدود ذہنیت کا شکار ہیں کہ ہر آنے والا نیا رجحان ہماری آنکھوں کو خیرہ کئے دیتا ہے اور ہم اسکے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ کیا ہماری تہذیب، فنون لطیفہ یا پھر اذواق اس قدر قابل عمل یا قابل فخر نہیں کہ ان کا تتبع کیا جا سکے۔ آخر ان نئے رجحانات میں کن لوگوں نے حصہ لیا۔ تغیر کے ارتقاء میں کئی نسلوں کا ہاتھ ہوتا ہے آخر ہماری تغیر کے ارتقاء کا گراف کہاں ہے، اس کی سمت کیا ہے اور کب اس نے کروٹ لی۔

خیر یہ بات بھی واضح ہے کہ پاکستان میں تہذیب یا کلچر کا مسئلہ ہنوز سلجھ نہیں سکا۔ علماء اس بحث و تکرار میں ہیں کہ آخر اس کلچر کو موہنجو دڑو سولائزیشن کے ساتھ جوڑا جائے یا کسی پرانی مسلم ثقافت سے یا پھر کسی عقیدہ کے حوالے سے اجتماعیت پر۔ اگر ہم ان میں سے کسی پر تکیہ کر بھی لیں تو کیا ہم ثقافت کے معیارات پر پورے اترتے ہیں؟ یا پھر وہ مبادیات جن کے باعث یہ کلچر تشکیل پاتا ہے اور اس سے انفرادیت بھی قائم ہوتی ہو؟

بہر کیف پاکستان کی ثقافت خواہ ذاتی ہو یا پھر کئی ثقافتوں کا ایک کوکٹیل۔ ہم جدید نسل کے رجحانات کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے آیا کہ وہ کس رجحان سے بدزن ہوئے یا پھر کونسا رجحان ان کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ آخر ان کے سفر یا تغیر کے ارتقاء کی سمت کیا ہے؟

سب سے پہلے تو یہ بات کہ نئی نسل کے ثقافتی رجحانات وہی ہیں جو ان کی بزرگوار نسل نے ان میں پیدا کئے ہیں نئی نسل ظاہر ہے کہ پرانی پود کی جانشیں اور تربیت یافتہ ہے۔ لہذا نئی نسل کی تربیت جن لوگوں نے کی ہے ان کی اور نئی نسلوں کی ثقافت میں کوئی قدرتی رابطہ تو ضرور ہونا چاہیے۔ کیونکہ کوئی بھی رجحان دفعتاً صورت پذیر نہیں ہو جاتا۔ وہ تو ایک طویل سلسلے کی آخری شکل ہوتی ہے۔ لہذا نئی نسل کے رجحانات کی نقاب کشائی کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ ان رجحانات کے سرچشمے کہاں سے پھوٹے۔ میں ذاتی طور پر نئی نسل کی کسی مخصوص و منفرد ثقافت سے باخبر نہیں ہوں مگر میں نے اکثر یہ شکایت سنی ہے کہ نوجوانوں میں خودسری، بدوضعی، بے لحاظی اور اخلاقی بے رنگی عام ہو رہی ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ان کے رویے، مزاجی یا بے سماجی رویوں کا رنگ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ان کی تفریحات ان کی وضع اور ان کا عام برتاؤ عجیب و غریب ہوتا جا رہا ہے اور وہ ایک ایسی زندگی اختیار کرتے جا رہے ہیں جو لاابالی اور بے وضع اور بے فکرے لوگوں کا ہونا چاہیے۔

ممکن ہے نئی نسل پر یہ الزامات درست ہوں مگر میں پھر کہوں گا کہ یہ سارے رجحانات نوجوانوں میں اچانک تو پیدا نہیں ہوئے ہوں گے۔ ان کے پیدا ہونے میں کسی طویل سلسلہ و اسباب نے حصہ لیا ہوگا اور ان کے نمایاں ہوتے ہوتے تعلیم و تربیت کی بہت سی منزلیں طے ہوئی ہوں گی لہذا میں نئی نسل کی کج روی اور بے راہ روی میں پچھلی نسلوں کو برابر کی نہ سہی مگر کچھ کچھ شریک مانتا ہوں۔

نئی نسل پر فکری اور روایت شکنی کا الزام لگایا جاتا ہے مگر اس کی ابتدا تو ایک سو سال پہلے کے تاریخی و سماجی واقعات میں ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب خالص عقلی اور مادی نظریہ ہائے حیات کو اس ملک میں پھیلایا گیا تھا۔ جب قدیم کو ہیچ اور ہر جدید کو لذیذ برحق کہا گیا تھا۔ جب مشرق کی ہر بات کو مغرب کی ہر ادا کے سامنے ذلیل کیا گیا تھا۔ وضع کی تبدیلی کا حادثہ بھی قدیم ہے۔ اور سماجی قیود اور پابندیوں کو توڑنے کی حرکت بھی کوئی نئی نہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ گزشتہ دور غلامی میں بہت سی چیزیں پچھلی نسلوں نے خوشامد سے اختیار کر لی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ مرض پھیلتا چلا گیا۔ اور ہر نئی نسل پرانی نسل کے مقابلے میں زیادہ کھلی بغاوتوں کی طرف بڑھتی گئی۔ مگر اس وقت کسی نے ان بغاوتوں کا تجزیہ نہیں کیا۔ پرانا نظام تعلیم ہمارے حق میں زہر قاتل تھا مگر اس کو آب حیات کہا جاتا رہا۔ اس سے علم اور روح کے رشتے کٹ گئے۔ مگر 1960ء سے پہلے کسی نے اس کے خلاف آواز بلند نہ کی۔ شبلی، اکبر اور اقبال بلاشبہ چیختے رہے مگر حالی کی مغربی پیروی کا زہر کچھ ایسا پھیل گیا تھا کہ لوگ انتہاؤں کی طرف بڑھتے گئے تا کہ وہ مقام آ گیا جو قدرتی ارتقائی منزل کے طور پر ایک ایسی سرحد پر واقع ہے جسے دیکھ دیکھ کر پچھلی نسل کے لوگ اب دہشت زدہ سے ہو رہے ہیں حالانکہ یہی لوگ دراصل اس صورت کے ذمہ دار ہیں کیونکہ نئی نسل کا کردار انہی کی ابتدائی کج روی کی زیادہ بگڑی ہوئی شکل ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ مسلمانان ہندوستان کی گزشتہ ایک صدی ان کے فکری اور روحانی افلاس کی صدی تھی جس میں انہوں نے کسی کمزوری کی بنا پر چبائے بغیر نگلنے کی عادت ڈال لی تھی۔ ظاہر اس کا نتیجہ فکری سوءِ ہضم ہے جس کی شکایت اب قومی معالجوں کو پریشان کر رہی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب مصیبت فکر و ادب کے مطالعہ سے پیدا ہوئی مگر میں کہتا ہوں کہ یہ مغربی فکر سے پیدا نہیں ہوئی مغربی فکر و ادب کو چبائے بغیر نگلنے کی عادت سے پیدا ہوئی ہے۔ ہمارے ملک میں مغرب کے حکماء ادبا کی پوری بات کسی نے نہیں سنی۔ نیم بہروں کی طرح بس آدھی بات ہی سنی جاتی ہے۔ فرانسیسی انجینئر ادیب (Sorel) کو پڑھنے والوں نے یہ تو پڑھ لیا کہ پرانے ہر نظام کو درہم برہم کر دینا ہی معاشرہ کا سب سے بڑا فرض ہے۔ مگر یہ نہ جانا کہ کسی نظام کو درہم برہم کرنے والوں کے پہلو بہ پہلو مغرب میں انسان دوستوں کے ٹھٹ ایسے بھی کردار ہیں جو

زندگی کے نظم میں انسان کی بقا جانتے ہیں۔ یہاں لوگوں نے روسو کے اعتراضات اور اس کی ذہنی یا عملی اوباشی کا قصہ تو سن لیا مگر روسو کے معاہدۂ عمرانی اس کی تعلیمی کتاب ''امیل'' پر نظر نہ ڈالی۔ غرض کچی پکی ہر قسم کی بات سن کر صرف برائی اور مادر پدر آزادی پر نظر رکھی اس کے تعمیری پہلو کو نظر انداز کر جاتے رہے۔ مادیت اور نفع پرستی اور روایت شکنی کے جو خوفناک فلسفے اس ملک میں پرورش پاتے رہے ہیں اور وہ نظام تعلیم کا جزو بن کر ہر نوجوان کے قلب و جگر میں پیوست ہوتے رہے ہیں۔ تربیت کے تمام راستے بند ہو گئے۔ گھر، مسجد اور مکتب سب کے پٹ بند۔۔۔ سکول، کالج، سینما، ٹھنڈی سڑک، پھر کلب، پھر گرل فرینڈ۔۔۔ یہ ہماری تربیت کے مقام بنتے رہے مگر بے احتساب، بے قید، بزرگوں کی ناک تلے، ان کے بھوں میں مسجد زیر سایہ خرابات ہوتی چلی گئی مگر سب اس نا ؤ نوش کو غفلت کی آنکھ سے دیکھتے رہے غرض ان رجحانات کا جائزہ نہ لیا گیا، نہ اس کی کوئی تشخیص ہوئی۔ اور ان کی آج بھی سہی معنوں میں تشخیص نہیں ہوئی اور یہ سب کچھ نئی پود نے نہیں پرانی پود نے ہی کیا۔۔۔ اور اس پر تعجب ہے کہ اپنے ہی لگائے ہوئے ذقوم و خنظل کا زہر کڑوا مزا خود چکھا ہے اور اپنے لخت جگر کو گھر سے روپیہ چراتے، ڈاکے ڈالتے دیکھا ہے اور امریکی فلم کی مہربانی سے تو نئی پود کی ملامت کا باب کھول دیا گیا ہے۔

میری اس گفتگو سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں کسی ٹیڈی بوائے یا ٹیڈی گرل کی حمایت کر رہا ہوں مجھے تو یہ کہنا ہے کہ نئی پُود کی ثقافت یا برائیوں کا پہلا علاج یہ ہے کہ پچھلی نسل لے لوگ پہلے اپنے معالج بنیں مگر یہاں تو یہ ہے۔

مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

لہذا ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنے انداز حیات میں توازن استقامت اور حسن و خوبی پیدا کریں۔ اور اپنے بدلے ہوئے کردار کی مدد سے نئی پود کو محبت سے راہ راست پر لائیں، اور اپنی کج روی کا اعتراف کریں جس کی شاخِ تلخ سے یہ کڑوا پھل پیدا ہوا ہے۔ ہماری بحث میں ثقافتی رجحانات کا جو ذکر ہے اس کا بھی صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم نہیں ثقافت سے کیا مراد ہے؟ ممکن ہے ثقافت سے مراد تنگ اور چست لباس ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ ثقافت سے ایک سائیکل پر دو آدمیوں کا بیٹھنا مقصود ہو۔ عین ممکن ہے رقص دیکھنا ہو۔ یا فنکاروں کی کٹیا میں مجسمہ سازی ہو۔۔۔۔۔۔ غرض ثقافت کے کئی معنے ہو سکتے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں بھی نئی اور پرانی پود کا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ جو نئی پود کا خاص ذکر کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ نئے لوگوں میں کوئی خاص لہجہ ایسا پیدا ہو گا جو پچھلی نسل کو نیا معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اس سلسلے میں نئی چیز فقط اتنی ہے کہ نئی پود نے وہی باتیں برملا اور بے روی وریا کہنا اور کرنا شروع کر دی ہیں جن پر پچھلی نسل عمل تو کرتی تھی مگر زبان سے ان کے خلاف کہتی رہتی تھی۔۔۔ مثلاً میں نے امریکی فلم کو ہمیشہ ناپسند کیا مگر ہفتے میں دو دو تین تین بار اس کی زیارت کی۔ میں انگریزی لباس میں سفید کالر اور رنگین ٹائی کو بہت پسند کرتا ہوں مگر مجھے پتلون کی وضع سے نفرت رہی۔ پھر بھی گزشتہ کئی سالوں سے پتلون کی برہنگی کے خلاف نفرت بھی کئے جا رہا ہوں اور اس کو جسم پر لٹکائے بھی جا رہا ہوں۔ غرض قصہ وہی ہوا جس کو اکبر نے یوں ادا کیا ہے۔

شب گناہ و نماز سحر یہ خوب کہی

بتوں سے میل خدا پر نظر یہ خوب کہی

مجھے اپنی زندگی میں تین آدمیوں کی روش کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ میتھیو آرنلڈ کی روش پر جس نے ہمارے یہاں کے ناصحوں کی طرح وکٹورین کلچر پر اعتراضات تو کئے مگر خود وکٹورین کلچر کی تشکیل میں خود حصہ لیا۔ دوسرے بزرگ نیاز فتح پوری ہیں جن کی رومانی تحریروں نے اس ملک میں رومانیت کے راستے سے جنسی بے راہ روی کے لئے پہلی مرتبہ راستہ صاف کیا۔ مگر اب جنسی بے راہ روی کے بارے میں ان کے خیالات جب پڑھے جاتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے۔ اور تیسرا شخص جس کے قول و فعل میں تضاد کو دیکھ کر بے محابا ہنسی آ جاتی ہے وہ یہی ننگ وجود میں خود ہوں۔۔۔

میں نے خود اپنا ذکر اس لیے کیا ہے کہ میں کسی اور کو ملامت کرنے سے پہلے خود اپنا محاسبہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور قبل اس کے کہ میرے لوگ میرے قول و فعل کے تضاد کا پرچہ چیک کریں میں خود اپنے نفس کے خلاف گواہی دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اور شاید یہی طریقہ ہم میں سے ہر شخص کے لئے مناسب ہو گا۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ ثقافتی رجحانات کی بحث میں کسی ایک طبقے کو موضوع سخن بنانا درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ رجحانات دراصل مجموعی قومی خصائص سے پیدا ہوئے ہیں لہذا ان کے برے پہلوؤں کا مداوا یا تدبیر قومی پیمانے پر ہونی چاہیے۔ نئی پود کے مسائل کو محبت اور دل سوزی کے انداز میں حل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی تنگ پتلونوں یا پھیلی ہوئی شلواروں کی بھی اصلاح کیجئے مگر پہلے ان کے دلوں کو بدل ڈالیے اور اس بے اعتمادی کو دور کیجئے جو نہیں آپ سے، مجھ سے، قوم کے بزرگوں سے، پچھلی نسلوں سے، اور ان کی نمود و نمائش سے ہے۔ آج اگر ملکی ثقافت کی آخری دیوار بھی ان کے ہاتھ سے گر رہی ہے تو یہ بھی تو سوچئے کہ اسی ثقافت کی باقی دیواریں ان سے پہلے ہم ہی نے تو گرائی تھیں۔ بس اس غلطی کا اعتراف کر کے قومی ثقافت (اور ثقافت کیا ہے؟ یہ تو بے معنی لفظ ہے) انسانیت اور اعلیٰ شہریت کے چمن آراستہ کرنے میں نوجوانوں کی امداد کیجئے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ نوجوانوں میں صفائی اور ضمیر داری کا جوہر زیادہ موجود ہے۔ اس جوہر سے فائدہ اٹھایئے اور آگے بڑھ کر ان میں اس وفاداری اور اس اعلیٰ شہرت کے اوصاف بھی پیدا کر دیجئے جن کا اصل سرچشمہ ضمیر داری ہے! یہ کام اگر کسی کو کرنا ہو محبت اور صرف محبت سے انجام پا سکتا ہے۔

محبت ہی اس کارخانے میں ہے

محبت ہی سب کچھ زمانے میں ہے